خلیفہ عبدالحکیم اور عثمانیہ یونیورسٹی

محمد حبیب اللہ رشدی

خلیفہ عبدالحکیم عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے اُن چند پروفیسروں میں تھے جن سے ۱۹۱۹ میں یونیورسٹی کا افتتاح ہوا ۔ اس برعظیم میں عثمانیہ یونیورسٹی وہ اولین یونیورسٹی تھی جہاں سائنس اور تمام جدید علوم کی تعلیم انگریزی کے بجائے اردو میں دی جاتی تھی ۔ اس زمانے میں جدید علوم خصوصاً سائنس کا اردو میں پڑھایا جانا عجیب سمجھا جایا کرتا تھا ۔ یہ خیال بہت عام تھا کہ اردو یا ہندوستان کی کسی بھی زبان میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ اس میں علوم جدیدہ اور سائنس کو منتقل کیا جا سکے ۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کا زمانہ تھا ۔ ریاست کے باہر ہندوستان کے عام اہل الرائے حضرات کو اس طرف سوچنے کی ضرورت تھی اور نہ فرصت ۔ خود ریاست کے اندر اس خیال کے مخالفین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی، بہت سے مخالفین تو اس خیال کا مضحکہ اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے ۔

یونیورسٹی کالج کے افتتاح سے سال ڈیڑھ سال پہلے اردو میں علوم کی تعلیم کے لئے نصابی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی غرض سے ایک دارالترجمہ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں قائم کیا گیا تھا اور چند نصابی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا تھا ۔ اس یونیورسٹی کے لئے دوسرا مشکل مرحلہ پروفیسروں کے انتخاب کا تھا ۔ ریاضی، طبیعیات، کیمیا، فلسفہ، معاشیات وغیرہ علوم کو انگریزی میں پڑھانے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن ان علوم کو اردو میں معقول طریقہ پر پڑھا سکنے والوں کی تلاش بہت مشکل تھی ۔ بہر حال اس مشکل پر کسی نہ کسی طرح قابو پالیا گیا ۔ ریاضی کے لئے ایک نہایت قابل آدمی قاضی محمد حسین (رینگلر) پہلے سے دارالترجمہ میں موجود تھے، انہیں ریاضی کا پروفیسر بنایا گیا ۔ اسی طرح سائنس کے ایک قابل آدمی چودھری برکت علی مرحوم اور معاشیات کی تعلیم کے لئے الیاس برنی بھی دارالترجمہ سے لئے گئے اور شعبۂ فلسفہ کے لئے خلیفہ عبدالحکیم کا انتخاب کیا گیا ۔

کالج کا پہلا تعلیمی سال ختم ہوچکا تھا کہ میں جون یا جولائی ۱۹۲۰ میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں داخل ہونے کے لئے گیا ۔ مجھے سائنس سے بہت دلچسپی تھی اس لئے یہ ارادہ تھا کہ مضامین اختیاری میں طبیعیات اور کیمیا کے مضامین لوں ۔ وہاں معلوم ہوا کہ سائنس کے مضامین کے ساتھ ریاضی کا لینا لازمی ہے۔ میں حساب میں بہت کمزور تھا لیکن الجبرا اور اقلیدس میں بہت اچھا تھا ۔

اس وقت کسی نے یہ نہیں بتایا کہ حساب کا جھگڑا میٹرک میں ختم ہوچکا ہے اب صرف الجبرا اور اقلیدس سے کام پڑے گا - یہ بات مجھے کئی برس کے بعد معلوم ہوئی - غرض ریاضی سے گھبراکر سائنس کو ترک کرنا اور شعبہ فنون کے مضامین میں سے انتخاب کرنا تھا - لطف کی بات یہ ہے کہ نہ ہم طالب علموں میں سے کسی کو یہ خیال تھا اور نہ کسی بزرگ نے یہ سمجھایا کہ ہمیں ایسے مضامین کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے جو ہمارے آئندہ کے پیشوں میں کارآمد ہوں - ہم سب کا خیال یہی تھا کہ بس ہمیں بی - اے پاس کرنا ہے، خواہ کسی مضمون میں ہو - میری دلچسپی کے چار مضامین تھے: نفسیات، معاشیات، فارسی، اردو - لیکن صرف تین مضمون لئے جاسکتے تھے - ہم چند طلبا معاشیات کی جماعت میں جا بیٹھے - الیاس برنی صاحب کا پہلا لیکچر سنا - انہوں نے معاشیات کا مقصد سمجھایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا آپ لوگ ہر مضمون کی جماعت میں بیٹھئے اور جن مضامین سے دلچسپی ہو وہ لیجئے - ان کی رائے سے بڑی ڈھارس بندھی اور اطمینان ہوا کہ ہمیں مضامین بدلنے کا موقع حاصل ہے -

مجھے منطق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس مضمون سے ایک طرح کا تنفر تھا - معاشیات کے لیکچر کے بعد میں شاید اٹھ کر چلا جاتا مگر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت سرخ و سفید پروفیسرجو انگلو انڈین معلوم ہوتا تھا کلاس میں آیا - میں آل سینٹس انسٹیٹیوشن میں پڑھ چکا تھا - وہ اٹالین رومن کیتھولک مشن کا اسکول تھا - وہاں کا مقتدر اعلیٰ ایک اٹالین پادری فادر گریبلی تھا جو ریکٹر کہلاتا تھا - اونچا پورا، گورا چٹا آدمی، زعفران کی سی سرخ لمبی ڈاڑھی، ٹخنوں تک لمبا سفید چغہ پہنے، اسکول کی جماعتوں کے درمیان گلیاری میں ٹہلتا رہتا تھا - ہیڈ ماسٹر ایک انگلوانڈین مسٹرفنی مور تھے - وہ کسی کالج میں پروفیسر ہوکر چلے گئے تو ان کی جگہ ایک انگریز مسٹر راس نے لی - مسٹر راس گورے چٹے بوڑھے آدمی تھے - انگریزی بہت اچھی پڑھاتے تھے - اب یہاں یونیورسٹی کالج میں ایسا معلوم ہوا کہ مسٹر راس کا چھوٹا بھائی کرسی پر آ بیٹھا ہے - آس پاس کے طالب علموں سے پوچھا یہ کون ہیں - ایک طالب علم انہیں جانتا تھا کہا "یہ خلیفہ عبدالحکیم ہیں فلسفہ کے پروفیسر، اب یہ منطق پڑھائینگے" - منطق کا نام سن کر جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگوں مگر میں جماعت کے وسطی حصہ میں بیٹھا تھا، اٹھ کر بھاگنا محال تھا - مجبوراً بیٹھارہا کہ دیکھوں یہ "انگریز" خلیفہ کیا منطق چھانٹتا ہے - ہچکچاتے ہوئے خلیفہ صاحب نے زبان کھولی - چند ہی فقروں کے بعد معلوم ہوگیا کہ یہ پنجابی ہیں - ابھی ابھی ہم نے پروفیسر الیاس برنی کا لیکچر سنا تھا جو بلند شہر (یو پی) کے تھے - انگریزی نثر کے پروفیسر مسٹر نارائن گنا جی ولنکر صوبہ بمبئی کے تھے - انگریزی

نظم کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف صوبہ' مدراس کے تھے۔ دینیات لازمی کے پروفیسر مولانا عبدالواسع بھوپال کے تھے اور اردو کے مشہور معروف پروفیسر سید وحیدالدین سلیم پانی پت کے تھے ۔ (جو ویسے تو پنجاب کی سرحد میں تھا مگر اس کو پنجاب اور یو۔ پی کا آمیزہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا) ۔ رک رک کر چند فقرے ادا کرنے کے بعد خلیفہ صاحب کی زبان میں وہ روانی پیدا ہوگئی کہ پوری جماعت ہمہ تن گوش ہوگئی ۔ زبان سے الفاظ نہیں پھول جھڑ رہے تھے ۔ مغربی خیالات اردو زبان میں اس خوبی سے ادا ہو رہے تھے کہ ہم سب حیرت کے ساتھ سنتے رہے ۔ فن منطق کا مقصد بیان کیا ، اس کی تشریح کی کہ منطق نام ہے فکر کے قوانین ناظمہ کا ۔ ان کے لیکچر کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ اگر پڑھنے کے قابل کوئی علم ہے تو وہ منطق ہے ۔ غرض میں نے اپنی حد تک یہ طے کرلیا کہ معاشیات اور منطق تو قطعی پڑھونگا۔ نفسیات کے شعبے کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا ۔ اب اردو اور فارسی میں سے کسی ایک زبان کو انتخاب کرنا تھا۔ بہت دنوں تک دونوں جماعتوں میں حاضری دیتا رہا ۔ فارسی کے پروفیسر عبدالحمید خاں صاحب کے اخلاق اتنے مسحور کن تھے کہ ان کی جماعت چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا ۔ اُدھر پروفیسر سلیم کے سے مشہور اور تجربہ کار شخص کے علم سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی بدنصیبی تھی ۔ آخر انتخاب مضامین میں یکسوئی کرنے کا وقت آپہنچا اور میں نے بادل نا خواستہ فارسی کو خدا حافظ کہا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی اپنی عمارت کی تعمیر تو کجا اس کا منصوبہ بھی تیار نہیں ہوا تھا ۔ کالج ' کتب خانہ ' رجسٹرار کا دفتر ' دار الترجمہ وغیرہ سب شہر کے ایک آباد محلہ میں کرایہ کی مختلف کوٹھیوں میں تھے۔ سب سے بڑی کوٹھی افضل حسین مرحوم چیف جسٹس کی تھی جس کے ایک حصہ میں کسی زمانے میں علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی بھی مقیم تھے اور کچھ عجب نہیں کہ ان کی مشہور شرح دیوان غالب اسی کوٹھی کے قیام کے زمانے میں لکھی گئی ہو ۔ اس کوٹھی میں کالج کی جماعتیں ہوتی تھیں جس کے ایک بڑے حصہ پر شعبہ' سائنس کا قبضہ تھا ۔ اس کے قریب ہی ایک کوٹھی میں خلیفہ عبد الحکیم دو اور پروفیسروں کے ساتھ مقیم تھے ۔ پاس ہی ایک کوٹھی کے ملحقہ کمرے میں پروفیسر سلیم اپنے ایک کرم فرما کی عنایت سے بلا کرایہ رہتے تھے۔ اس کے معاوضہ میں وقتاً فوقتاً نظمیں لکھ دیا کرتے تھے جو انہیں کرم فرما کے نام سے شایع ہوتی تھیں ۔ یہ کمرہ کوٹھی کے احاطہ میں بگھی خانہ اور اصطبل کے ساتھ تھا ۔ گمان غالب یہ تھا کہ یہ کمرہ کوچوان کے لئے بنایا گیا ہوگا ۔ جو لوگ مولوی سلیم سے نا خوش تھے وہ کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب اصطبل میں رہتے ہیں ۔ شام کو پانچ بجے بعض پروفیسر اور چند طلبہ مولوی صاحب کے ہاں آ جاتے تھے ' چائے بنتی اور ہر پیالی میں

لاھوری نمک کی ایک ڈلی گھمائی جاتی جس سے چائے نمکین ہو جاتی ۔ کوئی چاھے یا نہ چاھے یہی نمکین چائے اس کو پینی پڑتی ۔ ھم طلبہ تو استاد کا یہ تبرک بہ خوشی نوش جان کرتے مگر بعض باھر والے ناک بھوں چڑھاتے تھے ۔ جو پروفیسر ملنے آتے تھے وہ اپنے گھروں سے چائے پی کر نکلتے تھے اور عموماً چائے کا وقت گذر جانے کے بعد آتے تھے ۔ چائے کے بعد مولوی صاحب کمرے کے باھر صحن میں کھڑی چارپائی پر آ بیٹھتے بلکہ لیٹ جاتے ۔ آس پاس کرسیاں رکھ دی جاتیں ۔ ان پر ملاقاتی بیٹھتے ۔ مغرب سے کچھ پہلے محفل جمتی تو رات کے سات آٹھ بجے تک گرما گرم بحثیں ہوتیں ۔ کبھی شعر خوانی ھوتی ۔ چند طالب علم ' دو تین پروفیسر اور کبھی کبھی کوئی باھر والا ملاقاتی آجاتا۔ اس محفل میں خلیفہ عبد الحکیم اکثر آتے تھے ۔ ان کے آتے ھی محفل چمک اٹھتی ۔ مولوی سلیم اپنی ذھانت کے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر خلیفہ صاحب سے مرعوب سے رھتے تھے ۔ کالج میں خلیفہ صاحب کے لکچر سے ، جو ایک گھنٹہ ھوتا تھا ' ھمیں اتنا فائدہ نہیں ھوا جتنا ان نجی نشستوں سے ھوا ۔ کالج میں ان کے خیالات متعلقہ مضمون کی حد کے اندر رھتے تھے لیکن اس محفل میں ھر موضوع پر ان کے افکار ، خیالات اور دلچسپ فقرے سننے کا موقع ملتا تھا ۔

ریاست کے باھر خلافت اور کانگریس کی سیاسی تحریکوں کا طوفان بپا تھا۔ مسلمان کانگریس کے ساتھ تھے۔ گاندھی جی کو ''مہاتما'' کا خطاب دیا گیاتھا۔ ایسے زمانہ میں ایک خبر شائع ھوئی کہ مسز اینی بسنٹ نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی مخالفت کی ھے ۔ مسز اینی بسنٹ ایک عجیب خاتون تھیں ۔ یہ غالباً آئرش تھیں ۔ آئرلینڈ والے صدیوں سے انگریزوں کے اقتدار کا جوا اتار پھینکنے کی جد و جہد کرتے رھے تھے ۔ مسز اینی بسنٹ تھیاسوفی تحریک سے وابستہ تھیں ۔ یہ ایک طرح کی صوفیانہ تحریک تھی ۔ ھر مذھب کا آدمی اس میں حصہ لے سکتا تھا ۔ پہلی جنگ کے بہت پہلے ھندوستان میں اس تحریک کا بہت چرچا تھا ۔ اکثر شہروں میں تھیاسوفیکل ھال تعمیر ھوئے تھے جو اس تحریک کے ممبروں کا مرکز ھوتے ۔ مسز اینی بسنٹ نے اپنا صدر مقام شہر مدراس کے قریب ادیار کو بنایا تھا یا شاید ان کی آمد سے پہلے ھی وہ صدر مقام قرار پا چکا تھا ۔ جنگ سے کچھ پہلے انھوں نے ھندوستان کے لئے ''ھوم رول'' کی تجویز پیش کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ھندوستان کی حکومت ھندوستانیوں کے ھاتھ میں ھو ۔ اس تحریک کی وجہ سے وہ سارے ھندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں ۔ اب گاندھی جی کی برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی تحریک سے ان کی مخالفت پر لوگوں کو بڑا تعجب ھوا اور بہت سے لوگوں کی نظروں میں ان کا وہ احترام نہیں رھا ۔ اس خبر کے شائع

ہونے کے بعد حضرت سلیم کی اسی محفل میں خلیفہ عبد الحکیم اور مولوی سلیم ان کے اس بدلے ہوئے رویہ پر گفتگو کرنے لگے - ان دونوں کو اس معمر خاتون کی رجعت قہقری پر افسوس تھا - مسز بسنٹ کے متعلق یہ گمان تو نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ انگریز حکومت کی حامی بن گئی ہیں - اس وقت خلیفہ صاحب نے جو کہا وہ مجھے خوب یاد ہے - انہوں نے کچھ اس طرح اپنا خیال ظاہر کیا کہ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن میں نئی چیزوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی - مولوی سلیم کی یہ نادر خصوصیت تھی کہ ان کا ذہن ہر نئی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتا تھا - انہوں نے خلیفہ صاحب کے خیال کی پر جوش تائید کی اور کہا کہ بالکل یہی بات ہے کہ مسز بسنٹ زمانہ' حاضر کے ہندوستانی کو سمجھ نہیں رہی ہیں- اس گفتگو کے آخر میں خلیفہ صاحب نے کہا : '' مولوی صاحب ، اگر میں بوڑھا ہو جاؤں تو اپنے پوتے کا ساتھ دوں گا ، بیٹے کا بھی ساتھ نہ دوں گا- '' مطلب یہ کہ ذہنی زندگی یہی ہے کہ آدمی نئی تحریکوں ، نئے خیالات کو سمجھے اور ان کا ساتھ دے -

ایک مرتبہ چھٹیوں کے بعد خلیفہ صاحب اس محفل میں آئے- اس روز گفتگو میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے' چپ چپ سے بیٹھے تھے- مولوی سلیم نے چھیڑتے ہوئے کہا '' خلیفہ صاحب ' آج آپ کس سوچ میں ہیں '' - جواب دیا ''مولوی صاحب سوچ رہا ہوں کہ کوئی عظیم انقلاب آجائے اور مجھے کشمیر کا بادشاہ بنا دے'' - خلیفہ صاحب کے اس عجیب جواب پر ہم سب چونک پڑے - کہاں ہمارا فلسفی پروفیسر اور کہاں ریاست کی حکمرانی کی خواہش - سلیم صاحب نے درد بھری آواز میں کہا : '' اس راجہ کی حکومت نے مسلمانوں کا برا حال کر رکھا ہے - ''

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ خلیفہ صاحب اس بڑے انقلاب کی خواہش کیوں کر رہے تھے - اس کے بعد دیر تک کشمیر کے مسلمانوں پر حکومت کی سختیوں اور مظالم کا ذکر رہا - اس سلسلہ میں خلیفہ صاحب نے بتایا کہ وہ کسی چھوٹے سے لکڑی کے پل پر اپنے دوست سے کھڑے باتیں کرتے تھے - دوسری طرف سے ایک ہندو پانی کا گھڑا اٹھائے آیا اور پل کے ادھر ہی سے ان سے کہنے لگا کہ پل پر سے ہٹ جائیں - خلیفہ صاحب سے یہ واقعہ سن کر مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک چھوت چھات کا اثر لکڑی میں بھی سرایت کر جاتا ہے- ہمیں دکن میں اس قسم کا نہ کوئی تجربہ ہوا تھا اور نہ ہم نے کوئی ایسا واقعہ سنا تھا' اگرچہ دکن کے مشرقی اضلاع کے اور خصوصاً صوبہ' مدراس کے ہندو چھوت چھات میں بڑا مبالغہ کیا کرتے تھے - اسی نشست میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب اصلاً کشمیر کے

ہیں ۔ حضرت اقبال کے معتقد و مریدھی نہیں ان کے ہم وطن بھی ہیں۔

ہم نے اپنے پروفیسروں میں تین کو معیاری پروفیسر قرار دیا تھا - پہلا نمبر این جی ویلنکر کا تھا' دوسرا خلیفہ عبد الحکیم کا اور تیسرا الیاس برنی کا ۔ این-جی ۔ ویلنکر کوکنی برھمن خاندان کے تھے ۔ شہر بمبئی کے جنوب میں ایک ساحلی ضلع کونکن ہے۔ یہ لوگ اس ضلع سے منسوب ہوکر کوکنی یا کوکنست کہلاتے ہیں ۔ دکن کی اور قوموں کے مقابلے میں ان کا رنگ بہت گورا ہوتا ہے ۔ نہایت ذہین اور بڑی مستعد قوم ہے ۔ یہ مرہٹے نہیں ہیں مگر سارے مہاراشٹر پر چھائے ہوئے ہیں ۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ لوگ اصلاً ایرانی ہیں جو کسی قدیم زمانے میں سمندر کے راستہ آ کر بمبئی کے ساحل پر آباد ہو گئے اور ہندو مذھب اختیار کر کے برھمن بن بیٹھے -

پروفیسر ویلنکر کی ابتدائی تعلیم کسی مشن اسکول میں ہوئی تھی ۔ غالباً اس زمانہ میں وہ عیسائیت سے متاثر ہو کر عیسائی بن گئے ۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے لیکن صحت خراب ہوجانے کی وجہ سے تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہندوستان آ گئے ۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے عیسائیت کو ترک کردیا اور ''برھمو سماج'' کے ممبر بن گئے ۔ حیدرآباد دکن میں وہ ''برھمو سماج'' کے صدر تھے اور ھر سال آٹھ دس دن تک ''برھمو سماج'' کا گویا اک تہوار سا منایا جاتا تھا جس میں روزانہ کسی نہ کسی قابل مقرر کا لکچر بھی ہوتا تھا۔ لکچر ایسے لوگوں کے ہوتے تھے جو عام مذھبی رواداری اور انسانیت کو اھم سمجھتے تھے -

غرض پروفیسر ویلنکر نے خلیفہ صاحب کو بھی ایک لکچر دینے پر راضی کرلیا۔ ہم سب طالب علم اس روز بڑے اشتیاق کے ساتھ برھمو سماج کے جلسے میں گئے کہ دیکھیں خلیفہ صاحب انگریزی میں کیسی تقریر کرتے ہیں - تقریر کا موضوع فلسفیانہ تھا ۔ ہم لوگوں نے وقت سے پہلے پہنچ کر اگلی نشستوں پر قبضہ کرلیا ۔ خلیفہ صاحب کا لکچر شروع ہوا۔ رک رک کر ایک ایک جملہ ادا کرنے لگے ' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی میں تقریر کرنے کی مطلق عادت نہیں ۔ جلسہ میں بڑے اچھے اچھے مقرر اور ھمارے کالج کے علاوہ نظام کالج اور دوسری انگریزی درس گاھوں کے ھندو اساتذہ موجود تھے ۔ ہم عثمانیہ کالج والوں کو بڑی مایوسی ہوئی - ہم نے گردنیں جھکا لیں ۔ چند ھی منٹ کے بعد خلیفہ صاحب کی زبان کھلنے لگی ۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد خلیفہ صاحب فراٹے سے بول رہے تھے اور سارا مجمع بڑے انہماک کے ساتھ ان کی تقریر سن رھا تھا ۔ خاص خاص موقعوں پر تالیوں سے سارا ھال گونج اٹھتا تھا ۔ اسی زمانہ میں ان کی ایک نظم ''چاند سے خطاب'' شائع ہوئی تھی - لکچر میں اپنے موضوع کو فلسفیانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے، انسان کی روح کو

خدا کی ذات سے جو تعلق خاص ہے اس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی نظم کے یہ دو شعر اپنے مخصوص انداز میں سنا کر انکا ترجمہ کیا :

جرم زمین تار کو حائل اگر پاتا ہے تو
تو فرقت خورشید سے گھبرا کے گھناتا ہے تو
ایسے ہی اک اندھیر ہے مجھ کو بھی فکر آب و گل
چھپتا ہے جب نور ازل اس سے تو گھناتا ہے دل

ترجمہ سننے کے بعد کوئی پانچ منٹ تک تالیوں کا شور برپا رہا ۔ خلیفہ صاحب نے اپنے مقررہ وقت سے ڈیوڑھا وقت زیادہ لیا۔ لکچر کے بعد پروفیسر ویلنکر نے بھرائی ہوئی آواز میں لکچر کی شدومد کے ساتھ تعریف کی اور لکچرار کا شکریہ ادا کیا ۔ اس کامیاب لکچر کے بعد خلیفہ صاحب حیدرآباد کے عام علمی طبقہ میں اچھی طرح متعارف ہو گئے اور ضمناً عثمانیہ یونیورسٹی کا وقار بھی بڑھ گیا ۔

ایک روز حضرت سلیم کی محفل میں ہم چند طلبہ موجود تھے اور خلیفہ صاحب کی گلفشانیوں سے محظوظ اور مستفید ہو رہے تھے - محفل برخاست ہوئی اور میں نے اپنی بائسیکل سنبھالی ۔ خلیفہ صاحب نے پوچھا ''تم بائسیکل پر آیا کرتے ہو؟ کتنی دور ہے تمہارا گھر ؟'' میں نے کہا ''ہمارا گھر قدیم شہر کے اندر ہے، یہاں سے خاصا فاصلہ ہے''۔ کہنے لگے ''کتنی دیر میں گھر پہنچتے ہو؟'' میں نے کہا ''تقریباً ایک گھنٹہ میں پہنچ جاتا ہوں'' ۔ کہنے لگے ''افوہ، یہاں سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر رہتے ہو ۔ ایک گھنٹہ آنے میں ایک گھنٹہ جانے میں، روزانہ اپنی عمر کے دو گھنٹے صرف طے مسافت میں ضائع کرتے ہو'' ۔ وقت کی بات تھی - ان کا یہ کہنا کہ روزانہ میری عمر کے دو گھنٹے صرف آنے جانے میں صرف ہوجاتے ہیں، میرے دل میں تیر کی طرح لگا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس تضیع اوقات سے نجات کس طرح حاصل کروں ۔ یونیورسٹی کا ہوسٹل کالج کے قریب تھا مگر اس میں جگہ نہیں تھی ۔ میرے دل سے لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ہوسٹل میں آجاؤں ۔ ہوسٹل کے لئے ایک کوٹھی گذشتہ سال لی جا چکی تھی ۔ اس سال ایک اور کوٹھی ہندو طلبہ کے ہوسٹل کے لئے لی گئی اور اضلاع سے آنے والے ہندو طلبہ کو اس میں جگہ دی گئی تھی - میں نے اور دو تین ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ ''ہندو ہوسٹل'' میں ممکن ہے کوئی کمرہ مل جائے ۔ اس ہوسٹل کے نگران علی گڑھ کے رہنے والے پنڈت ہری ہر شاستری تھے جو سنسکرت کے پروفیسر تھے ۔ ہم لوگ ان سے ملے ۔ وہ شاید کوئی کمرہ دے دیتے مگر انہیں دکنی ہندو طلبہ کا خیال تھا جو چھوت چھات پر سختی سے عمل کرتے تھے ۔ ہم نے درخواست کی کہ کوٹھی کے احاطہ میں (اصل عمارت سے علحدہ) جو ''آؤٹ ہاوسز''

یعنی ملازموں کے کمرے ہیں وہ خالی پڑے ہیں وہی دے دیجئے ۔ اس پر وہ راضی ہوگئے ۔ ہم تین چار طلبہ کو علحدہ علحدہ کمرہ مل گیا ۔ اب ہمیں مولوی سلیم کی شام کی محفل میں روزانہ حاضری دینا آسان ہوگیا اگرچہ ہمیں تین مرتبہ کھانا کھانے کے لئے قدیم ہوسٹل کو جانا پڑتا تھا ۔

کالج میں تعلیمی کام پوری روانی کے ساتھ جاری تھا کہ خلیفہ صاحب کالج سے مہینہ ڈیڑھ مہینے کی رخصت لے کر وطن چلے گئے ۔ اسی زمانہ میں (شاید چند ہی ماہ پیشتر) مرزا محمد ہادی رسوا (مصنف ''امراو جان ادا'') پروفیسر کرسچن کالج لکھنو کا دارالترجمہ میں مترجم فلسفہ و منطق کی خدمت پر تقرر ہوا تھا ۔ پہلے اس خدمت پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مامور تھے ۔ ان کی کتاب ''فلسفہ اجتماع'' پر حیدرآباد کے اخباروں نے ایک شور مچایا تھا کہ اس کتاب میں بزرگان دین کی شان میں گستاخیاں کی گئی ہیں ۔ خبر نہیں کہ ان سخت تنقیدوں سے برہم ہوکر خود مولانا عبدالماجد نے استعفا دے دیا تھا یا سرکاری طور پر انہیں علحدہ کر دیا گیا تھا ۔

خلیفہ صاحب کی غیر حاضری میں ہمیں منطق پڑھانے کا کام مرزا ہادی رسوا کے سپرد ہوا ۔ مرزا رسوا منطق میں عالمانہ مہارت رکھتے تھے ۔ اگرچہ انہوں نے عربی منطق پڑھی ہوگی مگر انگریزی سے خوب واقف تھے اور منطق کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے ۔ اس وقت ان کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی ۔ آواز بہت پست اور باریک تھی ۔ انداز بیان بھی شگفتہ نہیں تھا، طلبہ میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے ۔ انہوں نے منطق کی ایک خاص بحث کو دائروں کی صورت میں ترتیب دیا تھا ۔ یہ ان کی اپنی ایجاد تھی ۔ میں نے بڑی احتیاط سے ان کے نوٹ اپنی بیاض میں لکھ لئے تھے ۔ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ ان کو لکھ لو کام آئینگے اور حقیقت میں وہ بڑے کار آمد دائرے ثابت ہوئے ۔ رخصتاً کے ختم ہونے پر جب خلیفہ صاحب واپس آئے تو مرزا ہادی رسوا صاحب سے نجات ملنے پر طلبہ نے گویا ''یوم نجات'' منایا ۔ ہم چند ہی طلبہ ایسے تھے جن پر مرزا صاحب کی فضیلت کا اثر تھا ۔ ہمیں افسوس تھا کہ ہمارے ساتھیوں نے نہ صرف ان سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان کی فضیلت کا خاطر خواہ احترام بھی نہیں کیا ۔

دسمبر کے مہینے میں سرمائی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو جاتا تھا ۔ اضلاع کے طلبا اور پروفیسر اپنے اپنے وطن کو چلے جاتے تھے ۔ اس سال سرما کی تعطیلات کے بعد جب کالج کھلا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ عبد الحکیم کی شادی ہوچکی ہے ۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ (رئیس بھیکم پور) اس زمانہ میں حیدر آباد دکن میں صدر الصدور (وزیر امور مذہبی) کے عہدہ پر فائز تھے ۔ حضور نظام کے ہاں مولانا کا بڑا اثر و رسوخ تھا ۔ وہ عثمانیہ

یونیورسٹی کی ایک فیکلٹی کے ڈین بھی تھے ۔ شادی کی تقریب میں انہوں نے ایک ڈنر دیا جس میں مولوی سلیم بھی شریک تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر مولوی سلیم نے ارتجالاً چند شعر سنائے جس سے ساری محفل محظوظ ہوئی۔ اڑتے اڑتے ایک شعر ہم لوگوں تک بھی پہنچا ۔ اس وقت اس کا پہلا مصرعہ یاد نہیں دوسرا مصرعہ یہ ہے جس میں سلیم صاحب نے خلیفہ صاحب سے خطاب کیا ہے :

تو وہ دولھا ہے کہ شرمندہ دلھن ہے تجھ سے

اسی زمانہ میں جناب ہارون خاں شروانی پروفیسر تاریخ کی بھی شادی ہوئی تھی ۔ ہوسٹل کے طلبہ نے یہ طے کیا کہ ان دونوں پروفیسروں کو شادی کی خوشی میں ایک ڈنر دیا جائے ۔ چنانچہ ڈنر ہوا اور ایک تصویر بھی لی گئی جس میں دونوں دولھوں کے ساتھ دو طالب علم دولھے بھی ہیں جن کی انہیں دنوں میں شادی ہوئی تھی ۔ تقریباً چالیس سال پہلے کی یہ یادگار تصویر حسن اتفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے ۔

سر اکبر حیدری نے ایک تعلیمی خدمت یہ بھی کی کہ نوجوان پروفیسروں کو آسان شرائط پر قرضہ دئے جانے کی اسکیم حکومت سے منظور کرا لی تاکہ وہ یورپ جا کر اپنے اپنے شعبوں کی اعلیٰ تعلیم پاسکیں ۔ خلیفہ صاحب کو بھی قرضہ دیا جانا منظور ہوا ۔ ۱۹۲۳ میں ہم نے ایف ۔ اے کا امتحان پاس کیا اور خلیفہ صاحب یورپ روانہ ہوئے ۔ اگر وہ موجود ہوتے تو شاید میں بی۔ اے میں فلسفہ کا مضمون لیتا ۔ ڈھائی تین سال کے بعد خلیفہ صاحب پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس آئے ۔ میں بی ۔ اے کر کے ایم ۔ اے میں تھا ۔ گرائجوئٹ طلبہ کے ہوسٹل کے لئے ایک علیحدہ کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی جو ہمارے سابقہ ہندو ہوسٹل کے قریب تھی ۔ خلیفہ صاحب نے اس کے برابر والی کوٹھی کرایہ پر لی ۔ اب پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ خلیفہ صاحب اپنی بیگم اور صاحبزادے کو لے آئے تھے ۔ پہلی دفعہ میں نے ان کے صاحبزادہ کو دیکھا تین چار سال کی عمر تھی ۔ خلیفہ صاحب نے بتایا کہ اس کا نام ”عارف حکیم“ رکھا ہے ۔ اس زمانے میں اس ترکیب کے ناموں کا بالکل رواج نہیں تھا ۔ مولوی سلیم پہلے شخص تھے جنہیں ہندوستانی ملسمانوں کے پرانے انداز کے ناموں کو بدلنے کا خیال پیدا ہوا ۔ وہ کہتے تھے کہ ترکی انداز کے دو لفظی نام رکھے جائیں ۔ انہوں نے اس قسم کے ناموں کی دو بڑی بڑی فہرستیں بنائی تھیں ، لڑکوں کے ناموں کی ایک فہرست اور لڑکیوں کے ناموں کی ایک فہرست ۔ اگر کوئی ملاقاتی اپنے لڑکے یا لڑکی کے لئے نام تجویز کرنے کی فرمائش کرتا تو اپنی فہرست میں سے دو تین نام بتادیتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ صاحب کو اس تجویز کا ضرور علم تھا ۔

جامعۂ عثمانیہ کا پہلا کانوو کیشن
(کھڑے ہوئے) دائیں طرف سے دوسرے
خلیفہ عبد الحکیم (صفحہ ۳۴)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved. ©2003-2006

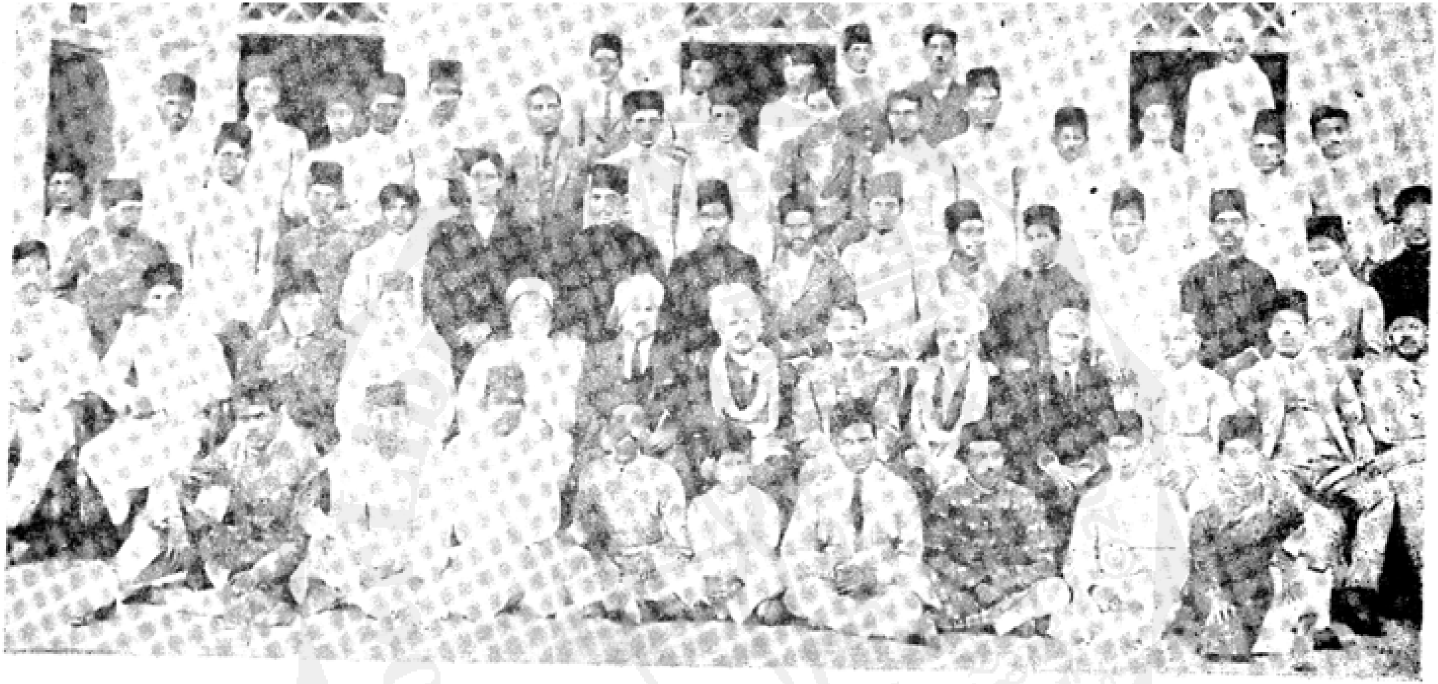

به تقریب شادی خلیفه عبد الحکیم و هارون خان شروانی

اقامت خانه قدیم جامعہ عثمانیہ (۱۹۲۱)

کرسیوں پر — (دائیں سے بائیں) (۱) ڈاکٹر عنایت علی خاں (معالج ہوسٹل) (۲) حمید احمد انصاری (رجسٹرار)
(۳) بابو امرت لال سیل (ریاضی) (۴) این ۔ جی ویلنکر (۵) خلیفہ عبد الحکیم (ہار پہنے ہوئے) (۶) ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی (۷) ہارون خان شروانی (ہار پہنے ہوئے) (۸) وحیدالرحمن (پروفیسر طبیعیات) (۹) سید وحیدالدین سلیم پانی پتی
(۱۰) پنڈت ہری ہر شاشتری (۱۱) مولوی عنایت اللہ (۱۲) مہمان (۱۳) جمیل الرحمن پروفیسر تاریخ اسلام
(۱۴) مولوی فدا علی طالب (۱۵) مہمان

(مضمون نگار محمد حبیب اللہ رشدی طالب علم فسٹ ایر سب سے پچھلی صف میں بائیں طرف سے دوسرے)

ڈاکٹر عبد الحق بی لٹ ، پی ایچ ۔ ڈی (آکسن) عربی کے پروفیسر ہو کر کالج میں آئے ۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ لڑکپن میں عربی کی تعلیم کسی قدیم طرز کے عربی مدرسہ میں تکمیل کر کے انگریزی پڑھنے علی گڑھ جاپہنچے ۔ وہاں مولانا حالی سے ملے اور کہا جناب میں آپ کو اپنے شعر سنانا چاہتا ہوں ۔ انہوں نے ان کی کم عمری اور ہیئت کذائی کو دیکھ کر فرمایا ، میاں صاحبزادے شعر شاعری میں مت پڑو ' اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ صرف کرو ۔ انہوں نے کہا : '' مولانا شاید آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اردو شعر سناؤں گا ۔ نہیں اپنے عربی شعر سنانا چاہتا ہوں '' ۔ اس پر تو مولانا حالی چونک پڑے۔ کہا '' سناؤ '' شعر سنائے ۔ شعر تو خیر کیا ہونگے مگر مولانا حالی کو اتنا اندازہ ہوا کہ یہ کم عمر لڑکا عربی پڑھ کر آیا ہے ۔ شاید انہوں نے یہ خیال کیا کہ علی گڑھ میں انگریزی شروع کرنے سے بہتر ہوگا کہ یہ مصر چلا جائے اور وہاں عربی کی تعلیم مکمل کر لے ۔ غالباً انہوں نے عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری کو سفارشی خط دیا ہو گا ۔ عبد الحق حیدر آباد واپس آئے ' عزیز مرزا سے ملے ۔ انہوں نے کہا '' افسوس ہے تمہیں وظیفہ دے کر مصر نہیں بھیج سکتا کیوں کہ اس زمانہ میں مصری حکومت سے انگریزی حکومت کے تعلقات خراب ہیں ۔ انگریزی حکومت کو ممکن ہے یہ نا گوار گذرے کہ حکومت نظام اپنے طالب علم مصر کو بھیج رہی ہے۔ ہم تمہیں مصر جانے کا سفر خرچ دیتے ہیں، تم جامعہ ازہر میں داخلہ لے لو '' ۔ غرض عبد الحق سفر خرچ کی رقم لے کر بمبئی پہنچے اور جہاز کا ٹکٹ خرید لیا ۔ وہاں کسی طرح مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات ہو گئی ۔ وہ اس زمانے میں رسالہ الہلال نکالنے کی فکر میں تھے ۔ انہیں روک لیا کہ تم عربی اخباروں اور رسالوں سے ترجمہ کا کام سنبھال لو۔ دو تین مہینے ان کے ساتھ ساتھ پھرتے رہے ۔ مگر معلوم نہیں کس بات سے ناراض ہوئے کہ مصر جانے کا تہیہ کر لیا۔ دریافت سے معلوم کہ جہاز کا ٹکٹ چھ مہینے تک کار آمد رہتا ہے اور ابھی اس کی مدت باقی تھی ۔ یہ مصر چلے گئے ۔ وہاں کچھ مدت گذار کر قسطنطنیہ گئے اور خشکی کے راستہ سے یورپ کے درمیانی ملکوں سے گذرتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ لطف یہ ہے کہ اس وقت تک انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے ۔ تقریباً پچیس سال انگلستان میں رہے ۔ پہلے بی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مولوی سلیم سے ان کی خط و کتابت تھی ۔ مولوی صاحب کو انہوں نے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جس میں وہ بی لٹ کا گون پہنے تھے ۔ یہ تصویر مولوی صاحب نے ہم سب کو دکھائی تھی ۔ اس مدت میں ایک مرتبہ حیدر آباد آئے اور وظیفہ منظور کرا کر پھر انگلستان گئے اور ڈی ۔ فل (پی ۔ ایچ ۔ ڈی) کی ڈگری لے کر واپس آئے ۔

ڈاکٹر عبد الحق انتہا کے سیاہ فام تھے ۔ ناک نقشہ نہایت سڈول ۔ تصویر دیکھئے تو بڑے خوبصورت آدمی معلوم ہوتے تھے مگر رنگ بلا کا سیاہ تھا ۔ ڈاکٹر عبد الحق اور خلیفہ عبد الحکیم بڑے گہرے دوست بن گئے ۔ روزانہ شام کو دونوں ٹہلنے نکل جاتے تھے ۔ دیکھنے والوں کی بڑی تفریح تھی کہ ایک سرخ و سفید اور دوسرا انتہائی سیاہ آدمی ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسکراتے باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ بعض طالب علموں نے اس اجتماع کا نام ''بلیک اینڈ وھائٹ،، رکھ دیا تھا جو ایک مشہور شراب کا تجارتی نام ہے ۔

۱۹۲۷ میں میں ایم ۔ اے کا امتحان دے کر ہوسٹل سے اپنے گھر چلا گیا اور پھر کشمکش حیات میں ایسا مبتلا رہا کہ حیدر آباد شہر کے باہر باھر ہی رہا یہاں تک ۱۹۴۷ میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی ۔ اس بیس سال کی مدت میں چند ہی مرتبہ خلفیہ صاحب سے سرسری طور پر ملنے کا اتفاق ہوا ۔ ۱۹۴۸ میں ریاست حیدر آباد کا خاتمہ ہوگیا ۔ ۱۹۴۹ کے آغاز میں میں پاکستان چلا آیا اور ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں لاہور گیا ۔ وہاں میرے بزرگ کرم فرما ملک حبیب احمد صاحب نے اپنے ہاں ٹھیرا لیا ۔ جو کوٹھی ملک صاحب کو ملی تھی وہ وارث روڈ پر ہے ۔ اسی سڑک پر چند قدم کے فاصلہ پر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا کر کی متروکہ کوٹھی میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا قیام تھا۔ اتفاقاً کسی کی زبان سے نکلا کہ خلیفہ صاحب یہیں رہتے ہیں ۔ بس میں بے اختیار وہاں پہنچا ۔ تیس برس کے بعد استاد شاگرد پھر اکھٹے ہوئے ۔ لیکن دونوں بدلے ہوئے تھے ۔ خلیفہ صاحب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے قیام کے سلسلے میں متردد تھے اور میں سخت پریشان حال تھا کہ خود بے روزگار تھا اور بیوی بچے حیدر آباد دکن میں پھنسے ہوئے تھے ، ان کے بلانے کی کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی ۔ بہر حال ان دنوں جو چند ملاقاتیں ہوئیں ان سے اس قدیم ربط کی تجدید ہو گئی ۔ سرما کا آغاز ہی تھا کہ مجھے نزلہ زکام ہو گیا ۔ اس حالت میں مجھے دیکھتے ہی خلیفہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا— ''دکنی بچے پر لاہور کی سردی نے حملہ کر دیا ،، — میں نے کہا ''ابھی سردی کہاں شروع ہوئی ہے ۔ نزلہ زکام تو کبھی کبھی گرما میں بھی ہو جاتا ہے ،، ۔ کہنے لگے '' نہیں یہ دکن کی سردی نہیں ہے لاہور کی سردی ہے سخت احتیاط کرو،، ۔ ان ملاقاتوں کی یادگار خلیفہ صاحب کا صداقت نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنی مہربانی سے میرے متعلق اپنے اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ۔

چند ہی ماہ کے بعد میں ریلوے روڈ اور پھر نسبت روڈ پر چلا گیا اور پھر کراچی آ گیا ۔ وارث روڈ والی وہی چند ملاقاتیں آخری ملاقاتیں تھیں ۔ کراچی میں کبھی کبھی خبر ملتی تھی کہ خلیفہ صاحب آئے تھے اور چلے گئے ۔

کب آئے اور کہاں ٹھیرے تھے اس کا علم نہیں ہوتا تھا ۔ آخر ۱۹۵۹ میں اچانک یہ خبر اخبار میں پڑھی کہ خلیفہ عبد الحکیم کراچی میں جناب ممتاز حسن صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے ، یکایک قلب کا دورہ پڑا اور حرکت قلب کے بند ہو جانے سے جاں بحق ہو گئے ۔ اس زمانہ میں خود بیمار تھا یہ خبر پڑھ کر عجب حالت طاری ہوئی ۔ مجھے اپنی زندگی کی وہ صبح یاد آئی جس میں خلیفہ صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ آئندہ مصاف زندگی کے لئے ہمیں تیار کر رہا تھا اور ہمارے حوصلے بڑھاتا تھا ۔

خلیفہ عبدالحکیم کی عمر میں اور ہم طالب علموں کی عمروں میں کوئی بڑا تفاوت نہیں تھا ۔ ہم میں سے اکثروں سے وہ پانچ سات سال ہی بڑے ہونگے ۔ ان کے شاگردوں میں دو چار طالب علم ایسے بھی تھے جو ان کے ہم عمر بلکہ ان سے کچھ بڑی عمر کے ہونگے ۔ وہ کبھی اپنے پروفیسر ہونے کا رعب کبھی نہیں جماتے تھے بالکل مساوات کا برتاؤ کرتے تھے ۔ میری جماعت میں ایک طالب علم ان کے ہم عمر یا سال دو سال بڑے تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کرچکے تھے ۔ حیدرآباد کے جاگیردار خاندان کے فرد تھے ۔ جماعت میں پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ساتھ لاتے تھے اور بے تکلف پان کھایا کرتے تھے ۔ کبھی کبھی پروفیسروں کو بھی پان پیش کرتے تھے ۔ خلیفہ صاحب پان کھانے کے عادی نہیں تھے ، اگر انہیں اس کی عادت ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ وہ بے تکلفی سے شاگرد کا پان بھی کھالیتے ۔

میں اپنی حد تک غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر دو ایک پروفیسروں کا اثر غالب رہا ۔ پروفیسر ویلنکر کا اور دوسرے خلیفہ عبدالحکیم کا ۔ سب سے زیادہ میں پروفیسر ویلنکر سے متاثر ہوا - ان کی انسان دوستی نے مجھے انسانیت کا احترام سکھایا ۔ وہ غریب سے غریب ، برے سے برے انسان کو بھی حقارت یا کم نظری سے نہیں دیکھتے تھے ۔ خود برہمن خاندان سے تھے مگر نیچ ذات کے اچھوتوں سے بھی ایسی مہربانی اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے کہ اس زمانے اور اس ماحول میں بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا ۔ انسانیت کا احترام اسلام کی خصوصیت تھی اور ہے مگر یہ خیال کر کے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ بر عظیم ہند کے بہت سے مسلمانوں میں چھوت چھات کا اثر پیدا ہو چلا تھا (اور شاید اب تک موجود ہے) ۔ ایسے مسلمان اچھوتوں سے اسی طرح نفرت اور حقارت کا برتاؤ کرتے تھے جس طرح کوئی برہمن یا اعلیٰ ذات کا ہندو کرتا ہے ۔

دوسرا اثر خلیفہ عبدالحکیم کا تھا جس نے میرے اندر تفکر کی عادت پیدا کی ۔ ان کا ذہن تقریباً ہر معاملہ میں فکر کرتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات یا نیا پہلو تلاش کر لیتا تھا ۔ نہ صرف وہ خود ہی فکر کرنے کے عادی تھے بلکہ ان کا طرز ایسا تھا کہ دوسرے کو بھی فکر کرنے پر اکسادیتا تھا ۔

ابتدائی عمر میں میرے ذہن کا ان سانچوں میں ڈھل جانا، عملی زندگی میں اکثر اوقات مشکلات کا باعث ثابت ہوا۔ مگر میں ان رجحانات کو صحیح اور اہم سمجھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مجھے ایسے استاد نہ ملتے تو خبر نہیں آج میں کس قسم کا انسان ہوتا۔ اس کا بڑا امکان تھا کہ ایسا انسان ہوتا جو اپنے آپ سے مطمئن نہ ہو۔ بہر حال یہ خیال غلط نہیں ہے کہ اچھے استاد اپنے شاگردوں کو صحیح راستہ پر ڈال کر قوم کی قسمت بدل سکتے ہیں مگر اچھے استاد ہیں کتنے ؟ سینکڑوں میں ایک دو اچھے استاد ہوں بھی تو ان کا اثر نقش بر آب ہوتا ہے۔ ایچ ۔جی ویلس کا یہ خیال غلط نہیں معلوم ہوتا کہ جرمن قوم کی ذہنی، علمی اور صنعتی ترقی جرمن پروفیسروں کی رہین منت ہے، ہوس اقتدار اور جنگ جوئی کے مجرم وہاں کے سیاست باز تھے۔